امام ابن حزم کے نزدیک استدلال واستنباط کے ایجابی قواعد-تعارفی و تجزیاتی مطالعہ

حافظ محمد رمضان*

ڈاکٹر حافظ حامد حماد**

Ijtihad is an important term and the basic part of Islamic Studies. Fiqh o Fatawa is the result of Ijtihad. The principles of Ijtihad are also called Usool-e-Fiqh. Islamic Scholars find the solution of non quoted problems of modern era in the light of Usool-e-Fiqh. It is as old as the Islam because it is used a lot of times by the Prophet and His Companions. At that time, it was not compiled but presented in the form of sayings and fatawas of the Prophet`s Companions. Imam Shafi is the pioneer who had compiled its principles and later on, a number of Islamic scholars had also continued it progressively. Ibn-e-Hazm is one of them who compiled the principles of Ijtihad or Usool-e-Fiqh and used it in his literary books. In this article, it is tried to provide the review of his way of Ijtihad and his diligence methodology.

اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ عزوجل نے امام ابن حزم کو اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں سے نوازا۔ آپ انتہائی قوی حافظے کے مالک اور انتہائی ذہین تھے۔آپ علم کا ایک سمند تھے اور اپنی مثال آپ تھے۔رجال کے معروف عالم امام ذہبیؒ آپ کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"رأس فی علوم الاسلام، متبحر فی النقل ، عدیم النظیر"[1]

"آپ علوم اسلامیہ کے مرجع،علوم نقلیہ کے سمند اور بے مثل ماہر تھے۔"

ابن حزمؒ نے اجتہاد کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا اگرچہ ہر دور میں یہ ہوتا رہاتاہم وہ اس کے دائرہ کار کو بہت وسیع کرنا چاہتے تھے۔فرماتے ہیں کہ جس شخص کے پاس جس قدر قابلیت ہو اسے اسی قدر اجتہاد سے کام لیناچاہیے،لکھتے ہیں:

"فرض علیٰ کل احد طلب ما یلزمہ علیٰ حسب ما یقدر علیہ من الاجتہاد لنفسہٖ فی تعرف ما الزمہ اللہ تعالیٰ ---"[2]

* پی ایچ ڈی سکالر،ادارہ علوم اسلامیہ،جامعہ پنجاب،لاہور۔۔

** اسسٹنٹ پروفیسر،شعبہ بیسک سائنسز اینڈ ہیومینیٹیز،محمد نواز شریف یونیورسٹی آف انجینئرنگ وٹیکنالوجی،ملتان۔

"ہر آدمی کے ذمہ اس قدر اجتہاد لازم ہے جس سے وہ اللہ کے واجب کردہ امور کو جان سکے۔"

اجتہاد کے اس میدان میں امام ابن حزم نے اپنی خداداد استدلالی صلاحیتوں سے خوب استفادہ کیا اور امت مسلمہ کے لیے ایک بیش قدر علمی ذخیرہ جمع کر دیا بلکہ اپنے خاص طریق استدلال کی بناپر آپ کا انداز ایک الگ مکتب فکر کے طور پر پہچانا گیا۔ امام ابن حزمؒ اجتہاد کے اساسی ماخذ سے استدلال و استنباط کرتے ہوئے اپنے خاص مکتب فکر کی وجہ سے کچھ قواعد کو مد نظر رکھتے ہیں۔ یہ قواعد، استدلال میں بطور اصول کے کام کرتے ہیں۔ ہم انہیں منہجی قواعد کا نام بھی دے سکتے ہیں۔

ابن حزمؒ کے ان منہجی قواعد کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

ایجابی قواعد

سلبی قواعد

طوالت سے بچنے کے لیے اس آرٹیکل میں صرف ایجابی قواعد کا بالاختصار ذکر کیا جائے گا اور سلبی قواعد کی تفصیل آئندہ کسی موقع پر پیش کی جائے گی۔ ان شاءاللہ

ایجابی قواعد سے مراد ایسے قواعد اور مقدمات ہیں جن سے مدد لیتے ہوئے امام ابن حزم مسائل کا استنباط و استخراج کرتے تھے۔ سلبی قواعد سے مراد ایسے قواعد ہیں جنہیں ابن حزمؒ نے کالعدم قرار دیا ہے اور انہیں صحیح مان لینے کی صورت میں اجتہاد و استدلال کے نتائج متاثر ہوتے ہیں۔ درج ذیل سطور میں ایجابی قواعد کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ظواہر نصوص سے تمسک:

امام ابن حزم کے مکتب فکر کا سب سے اہم وصف نصوص کے ظاہر سے استدلال واحتجاج کرنا ہے۔ ابن حزم درج ذیل آیت سے اخذ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہمیں نصوص کا ظاہر ہی کافی ہے۔

﴿أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَى عَلَيْهِمْ﴾[3]

بلکہ ایک مقام پر واضح الفاظ میں لکھتے ہیں:

اصل مذهبنا ان الاخذ بظاہر القرآن و الحديث الصحيح حق۔[4]

ہمارا اصول برحق ہے کہ قرآن اور صحیح حدیث کے ظاہر سے اخذ واستنباط کیا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ عموم سے اکثر استدلال کرتے نظر آتے ہیں کہ یہی ظاہر ہے۔

ظاہر پر عمل کرنا مستحسن امر ہے، نص کے ظاہر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا مگر ایسا نہ ہو کہ ایک نص کے ظاہر کو لے کر دوسری کے اظہر کو چھوڑ دیں یا جس مفہوم کو ظاہر سمجھے بیٹھے ہوں اسے ظاہر کہنا ہی محل نظر ہو یا جسے ظاہر کے خلاف سمجھ کر ہم نظر انداز کر دیں وہی ظاہر ہو۔ مثلاً بادی النظر میں مجاز اور کنایہ نص کا ظاہر نہیں ہوتا کہ یہاں الفاظ کے اصلی معنی کی بجائے دوسرے معنی مراد لیے جاتے ہیں، ابن حزم اسے ظاہر ہی میں شمار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عقلی یا شرعی دلیل کے تحت مجازی معانی الفاظ ہی میں موجود ہوتے ہیں۔

ظاہریت کو جو شر محض سمجھا جاتا ہے، اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ ظاہری علماء نے کئی جگہ اظہر کو چھوڑ کر ظاہر کو اختیار کیا یا ظاہر کے نام پر غلط استدلال کیا، جس کی وجہ سے اس کا دھبہ ظاہریت پر لگ گیا۔

ابن تیمیہ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ ابن حزم کی کتابوں میں اسلامی شعائر کی تعظیم نظر آتی ہے۔ رسالت مآب کی جانب جھکاؤ نظر آتا ہے۔ جس مسئلے میں کوئی حدیث مل جائے، ابن حزم کا رجحان اسی کی طرف نظر آتا ہے۔[5]

ظواہر سے تمسک ابن حزم کا ایسا قاعدہ ہے جو استخراج مسائل میں ہر جگہ کار فرما نظر آتا ہے۔ اس اصول کو فقہ ابن حزم سے نکال دیا جائے تو اس فقہ کا خاصہ و میزہ ہی تبدیل ہو کر رہ جائے گا۔ نص کے ظاہر کا تعین کرنے میں ابن حزم عموماً لغت یا عقلی مقدمات سے مدد لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ ظاہری میں لغت کا عمل دخل بہت زیادہ ہے۔ ایک اور قاعدہ جسے امام ابن حزم استدلال کے موقع پر پیش نظر رکھتے ہیں وہ روایات کا صحیح اور مستند ہونا ہے۔

صحت روایت کا اہتمام اور نسخ کی توضیح:

فقہی کتابوں میں نظر دوڑائی جائے تو اکثر مسائل کا مبنیٰ و ماخذ ضعیف روایت دکھائی دیتی ہے۔ ضعیف روایات پر فقہ کی عمارت کیسے کھڑی کی جا سکتی ہے حالانکہ آپ ﷺ نے اس سلسلے میں بہت سخت جملے ارشاد فرمائے ہیں۔ جس بات کا آپ ﷺ کی جانب منسوب ہونا مشکوک ہو اسے روایت کرنا درست نہیں کجا یہ کہ اس سے فقہی احکامات کا استخراج شروع کر دیا جائے۔ ابن حزمؒ کی یہ خوبی ہے کہ آپ صحیح روایت کا التزام کرتے ہیں اور یہ آپ کا اصول ہے کہ صرف صحیح روایت سے ہی اخذ و استدلال کیا جائے گا۔ ایک جگہ آپ تحریر فرماتے ہیں:

نص آنے کے بعد ،اگر ثابت ہو کہ آپ کی جانب اس کی نسبت درست ہے ،اس کی اتباع کے فرض ہونے میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں اور یہ کہ وہ اللہ کی مراد ہے قرآن کی تفسیر ہے۔[6]

کمزور روایات سے استدلال بہت بڑی غلطی ہے۔اس غلطی کو واضح کرنے کے لئے لکھتے ہیں کہ

" ولا اضل ممن يحتج بما لايصح نعوذ بالله من الخذلان"

غیر صحیح روایات سے استدلال کرنے والے سے بڑھ کر کوئی گمراہ نہیں۔[7]

مسائل کے استنباط میں یہ آپ کا منہج تھا کہ صرف صحیح روایت کو قبول کرنا ہے اور ضعیف کی توضیح کرنی ہے اگر اس سے کوئی استدلال کر رہا ہو۔المحلی کے مقدمے میں تحریر کرتے ہیں کہ جو شخص ہماری اس کتاب کا مطالعہ کرے گا اسے معلوم ہو جائے گا کہ ہم صرف اور صرف صحیح روایت ہی سے استدلال کرتے ہیں اور ضعیف سے استدلال کی مخالفت کرتے ہیں اور اس کا ضعف واضح کرتے ہیں اور اگر وہ منسوخ ہو تو اس کا منسوخ ہونا واضح کرتے ہیں۔[8]

یہی وجہ ہے کہ آپ کی کتب میں اسانید کی کثرت ملتی ہے اور آپ اس کے رواۃ اور استنادی مباحث پر گفتگو بھی کرتے ہیں۔احادیث کے علاوہ اقوال صحابہ میں بھی صحت وضعف کا اہتمام کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ علوم حدیث میں آپکی پختگی کا واضح ثبوت ہے۔آپ کی اس خوبی کا ابن تیمیہؒ یوں اظہار کرتے ہیں:

" وله من التميز بين الصحيح والضعيف والمعرفة باقوال السلف ما لا يكاد يقع مثله لغيره من الففقهاء۔"[9]

آپ کو صحیح وضعیف کی پہچان میں اور اقوال سلف کی معرفت میں وہ ملکہ حاصل ہے جو دیگر فقہاء کو شاید حاصل نہیں۔

امام ذہبی نے جو کہ سیر ورجال کے عالم ہیں،آپ کے بارے میں بڑی عمدہ بات کی ہے۔لکھتے ہیں کہ صحت حدیث کی پہچان حاصل ہونے کی وجہ سے مجھے ابن حزم سے محبت ہے مگر استنادی علل ورجال کے بارے میں مجھے ان سے بہت اختلاف بھی ہے۔[10]

خبر واحد کا وجوب:

خبر واحد سے مراد ایسی روایت یا حدیث ہے جو تواتر کی حد تک نہ پہنچی ہو۔ابن حزمؒ اس کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

جب کوئی ایک کسی ایک سے روایت کرے اور ان عادل لوگوں کی روایت آپ ﷺ تک جا پہنچے تو اس پر عمل کرنا بھی واجب اور اسکے صحیح ہونے کا یقین کرنا بھی واجب ہے۔

اس تعریف کے مطابق دو باتیں سامنے آتی ہیں:

خبر واحد پر عمل کرنا واجب ہے اور اسے شرعی احکامات کی بنیاد بنایا جائے گا۔

اسے قطعی الثبوت سمجھا جائے گا اور وہ یقین کا فائدہ دے گی۔

پہلی بات پر تو تقریباً تمام اہل علم کا اتفاق ہے کہ خبر واحد قابل حجت ہے اور عمل کو واجب کرتی ہے۔جب صحیح طور پر ثابت ہو جائے اور منسوخ بھی نہ ہو،البتہ دوسری بات میں اہل علم کا اختلاف ہے۔اکثر اہل علم کا خیال ہے کہ خبر واحد عمل کو واجب کرتی ہے علم کو نہیں۔یعنی ظن کا فائدہ دیتی ہے۔اسی بات کو ابن عبدالبر نے ترجیح دی ہے۔[11]

ابن عبدالبر لکھتے ہیں کہ باوجود اس بات کے کہ علماء خبر واحد سے علم قطعی کو واجب قرار نہیں دیتے تاہم وہ احکام واعتقادات میں اس کو بنیاد بناتے ہیں۔

ابن حزمؒ خبر واحد کے مفید یقین ہونے پر کئی دلائل رقم کرتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ مفید ظن ہونے کے نظریے پر نقد و جرح کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآنی آیت کے مطابق ظن حق کے بالمقابل کچھ بھی فائدہ نہیں دیتا۔اگر یہ ظن کا ہی فائدہ دیتی ہے تو ثبوت حق میں اس سے مدد نہیں لی جاسکتی اور اگر اس سے ثبوت حق مدد لینا درست ہے تو پھر یہ مفید ظن کہلانے کی بجائے مفید یقین ہوئی۔

ابن حزم بڑی صراحت اور وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ:

" ان کل ما نقله الثقة عن الثقة مبلغا الی رسول الله صلی الله علیه وسلم من قرآن او سنة ففرض قبوله و الاقرار به و التصدیق به و اعتقاده و التدین به۔۔۔" [12]

ابن حزمؒ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ بحیثیت اتباع سنت و قرآن میں کوئی فرق نہیں۔خبر متواتر کو ماننا اور اس پر عمل پیرا ہونا جس قدر ضروری ہے اسی قدر خبر واحد بھی عمل و اعتقاد کا تقاضا کرتی ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ تواتر علم ضروری اور بدیہی کا فائدہ دیتا ہے۔جیسا علم مشاہدے یا حسی ادراک سے حاصل ہوتا ہے۔

امام موصوف بڑے واضح االفاظ میں لکھتے ہیں:

" ان خبر الواحد العدل عن مثلہ الی رسول اللہ □ یوجب العلم و العمل معا و بھذا نقول۔[13]

صحیح خبر واحد جو آنحضرت ﷺ تک پہنچی ہو وہ علم و عمل دونوں کی موجب ہے۔

استقراء:

یہاں میں استقراء سے لغوی استقراء مراد لے رہا ہوں، اصطلاحی نہیں۔ یہاں اس سے مراد ہے کسی چیز کا احاطہ کرنا ہے۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی مسئلے پر گفتگو کی جاتی ہے تو اس کے صرف اہم پہلو ذکر کر کے جاتے ہیں یا یہ کہ اپنے مؤقف کی تائید میں صرف وہ دلائل ذکر کر دیئے جاتے ہیں جو بہت مضبوط ہوں یا یہ کہ مخالف مؤقف کی تردید میں بہت زیادہ دلائل ذکر کرنے کی بجائے ایک دو دلائل پر اکتفا کر لیا جاتا ہے، مگر ابن حزمؒ عموماً ایسا نہیں کرتے۔ وہ کسی مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے تقریباً تمام متفقہ امور زیر بحث لاتے ہیں اس کے حق میں تقریباً تمام دلائل ذکر کرتے ہیں اور تردید میں بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ایک بحث کئی کئی صفحات پر پھیلی ہوتی ہے۔

آپ استقراء کو بطور اصول اس طرح استعمال کرتے ہیں مثلاً فلاں مؤقف کے اتنے پہلو ہو سکتے ہیں اس سے زیادہ نہیں پھر ایک ایک کر کے سب کو غلط ثابت کرتے ہیں اور نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ مؤقف ہی فاسد اور غلط ہے۔ یعنی کسی بھی چیز کی زیادہ سے زیادہ جتنی بھی صورتیں بن سکتی ہوں اس کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اسی چیز کو یہاں استقراء کہا گیا ہے۔

استصحاب:

قاعدہ استصحاب امام ابن حزمؒ کے اجتہاد کے اصولی قواعد میں سے ایک کثیر الاستعمال اہم قاعدہ ہے۔ استصحاب صحبت اور مصاحبت سے ماخوذ ہے۔ اسکا مطلب ہے کہ جو چیز ماضی میں تھی اگر اس میں تبدیلی نہیں ہوئی تو وہ جوں کی توں سمجھی جائے گی۔ کسی مسئلے میں جب کوئی اور دلیل نہ ملے تو اس اصول کو استعمال میں لایا جاتا ہے۔

جو لوگ قیاس وغیرہ سے اخذ مسائل کرتے ہیں انہیں استصحاب کی ضرورت نہیں پڑتی۔ استصحاب کے اصول سے زیادہ تر ایسے فقہاء مدد لیتے ہیں جن کے مستقل بالذات اصول کم ہوں۔ استصحاب کی مراد دیکھ لیں تو پتہ چل جاتا ہے کہ دلیل نہ ہونے کی صورت میں یہ قابل عمل ہو گا۔

امام ابن حزمؒ کے نزدیک نص سے ثابت شدہ حکم اپنے حال پر برقرار رہے گا جب تک اس حکم میں تبدیلی کی دلیل نہ مل جائے۔ لکھتے ہیں:

"جب کسی امر میں کتاب وسنت کی نص موجود ہو اور پھر جو کوئی یہ دعویٰ کرے کہ حکم بدل گیا ہے یا ختم ہو گیا ہے، اس لئے کہ جس چیز بارے یہ حکم تھا وہ تغیر پذیر ہے، تو ایسے شخص پر ضروری ہے کہ وہ کتاب و سنت سے اس حکم کی تبدیلی کی دلیل پیش کرے۔ اگر وہ دلیل پیش کر دے تو اسکی بات صحیح ہے، نہیں تو اس کا دعویٰ بے بنیاد ہے۔ سب لوگوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ نص کے حکم پر تب تک عمل درآمد کرتے رہیں جب تک اس چیز کا نام باقی ہے۔ کیوں کہ یہ ایک یقینی چیز ہے اور حکم کی تبدیلی کا دعویٰ بے بنیاد ہے اور اس کی اللہ نے اجازت نہیں دی لہذا نص کے ہوتے ہوئے تبدیلی کا دعویٰ مردود ہے اور کذب بیانی ہے۔"[14]

استصحاب اور اباحت اصلیہ:

اللہ نے جب حضرت آدمؑ کو زمین پر بھیجا تو انہیں کہا تھا

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَى حِينٍ [15]

"تمہارے لئے زمین میں جائے قرار ہے اور ایک مدت تک فائدہ ہے۔"

ابن حزم فرماتے ہیں کہ اللہ نے متاع کے لفظ سے اشیاء کو مباح کر دیا پھر ان میں سے جسے چاہا حرام کیا۔[16] گویا اشیاء میں اصل اباحت ہے جو کہ نص قرآنی سے ثابت ہوئی۔ اب جب تک حرمت کی دلیل نہ ہو تو اشیا ء کو مباح ہی سمجھا جائے گا۔ یہ ہے استصحاب۔

امام ابن حزمؒ استصحاب سے ثبوت حکم کو بدیہیات میں سے شمار کرتے ہیں کہ اس سے کوئی اختلاف نہیں کرتا ہر چیز اپنی ثابت شدہ اصل پر قائم رہتی ہے۔

جس چیز کے بارے میں کوئی حکم وارد ہے اگر وہ چیز ہی بدل جائے یا وہ وصف بدل جائے جس پر حکم کا اطلاق ہوتا ہے تو حکم بھی تبدیل ہو جائے گا۔ مثلاً شراب سرکہ میں بدل جائے یا گندگی مٹی بن جائے یا خنزیر کا دودھ اگر بکری کا بچہ پی لے تو اب ان کا حکم بدل جائے گا کیوں کہ چیز کی ماہیت بدل گئی ہے لوگوں کی یا زمانے کی تبدیلی شرعی احکام میں تبدیلی نہیں لا سکتی۔ آپؒ لکھتے ہیں کہ یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ چکی ہے تغیر زمان و مکان اور حالات کی تبدیلی دین اسلام پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔[17]

استصحاب اور حقوق:

احناف اور مالکیہ کا خیال ہے کہ استصحاب سے کسی شخص کے نقصانات کا ازالہ کیا جاسکتا ہے مگر اس سے حقوق کا اثبات نہیں ہوتا یعنی ان کے نزدیک یہ دفع حقوق کیلئے حجت ہے۔اثبات حقوق کیلئے حجت نہیں۔مگر امام ابن حزمؒ تمام حالات میں استصحاب کا اصول جاری کرتے ہیں،دفع حقوق کا معاملہ ہو یا اثبات حقوق کا۔

اس اصول کے تحت اگر کسی نے وضو کیا اور پھر اسے وضو ٹوٹنے کا شک ہوا تو اس کا وضوء برقرار سمجھا جائے گا۔اسی طرح اگر کسی سیال چیز میں مردار وغیرہ گر جائے تو اس سیال کا کھانا پینا استعمال کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس کے رنگ،بو اور ذائقے میں تبدیلی نہ آئی ہو۔اسی اصول کی بنا پر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سب حیوانات کا بچا ہوا پانی،خواہ خنزیر کا ہو،پاک ہے۔

عموم سے استدلال:

عموم سے استدلال دراصل استصحاب ہی کے ذیل میں آسکتا ہے۔نص نہ ملنے کی صورت میں شریعت کے عمومی نصوص سے استدلال کرنا ایک عام اصول ہے۔بلکہ اہل ظواہر عام کے عموم ہی کو نص کا ظاہر کہتے ہیں جب تک دوسری نص سے اس کے خصوص کا نہ پتہ چلے۔امام ابن حزمؒ لکھتے ہیں:

'' واجب یہی ہے کہ ہر لفظ کو اسکے عموم پر محمول کیا جائے اور بغیر کسی توقف کے اس سے وہی مفہوم مراد لیا جائے جو اس کے نام کا تقاضا ہے۔اگر کسی دلیل سے ثابت ہو جائے کہ یہ لفظ اپنے عموم پر باقی نہیں ہے تو ہم اسے تسلیم کرلیں گے۔تمام اصحاب ظاہر،مالکیہ،شافعیہ اور بعض حنفیہ اسی کے قائل ہیں۔ہمارا مسلک بھی یہی ہے اور اس کی مخالفت جائز نہیں۔[18]

عموم پر عمل کرنے کی صورت میں حکم کا دائرہ کار بہت وسیع ہو جاتا ہے۔اور اسے خاص سمجھ لینے کی صورت میں اس حکم کے بہت سارے افراد یا اجزاء سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔بعض لوگوں کا خیال تھا کہ مخصص کی پہچان سے قبل عموم کی دلالت میں توقف کیا جائے گا اور بعض سمجھتے تھے کہ اسے خاص کیا جاسکتا ہے۔امام ابن حزمؒ اس کی سختی سے تردید کرتے ہیں۔

عموم کی مختلف صورتیں ہیں۔ان میں سے ایک صورت یہ ہے کسی لفظ میں کئی ایک معانی مساوی طور پر شریک ہوں۔اس طرح کے لفظ کا مفہوم حقیقی کہلائے گا، مجازی نہیں۔اس صورت میں لفظ کو ہر معنی پر محمول کرنا واجب ہے۔[19]

بعض اوقات الفاظ کو ان کے اصل معنی سے نکال کر دوسرے مطالب کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔اسی کو مجاز کہتے ہیں۔ حقیقت سے مجاز کی طرف یہ منتقلی عقلی یا شرعی دلیل کے تحت ہونی چاہئے۔ عقلی یا شرعی دلیل ہونے کی صورت میں الفاظ کا مجازی استعمال بھی الفاظ کے ظاہر کے دائرہ کار میں رہے گا۔

اس کی کئی ایک امثلہ ہیں۔مثال کے طور پر قرآن میں ہے:

﴿الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ﴾''[20]

جن سے لوگوں نے کہا کہ لوگ تمہارے لئے جمع ہو گئے۔

اسی آیت میں ''الناس'' سے مراد سارے لوگ نہیں ہیں بلکہ بعض لوگ ہیں۔ معنی کی یہ تبدیلی دلیل عقلی کی وجہ سے ہے کیوں کہ بمطابق عقل، خبر دینے والے لوگ جمع نہیں ہوئے تھے۔اسی طرح

﴿وَاسْأَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا﴾ [21]

جس بستی میں ہم تھے اس سے پوچھ لیجئے۔

یہاں قریہ سے مراد'' اہل قریہ'' یعنی بستی سے مراد'' بستی والے لوگ'' ہیں

نسخ اور دعویٰ نسخ:

نسخ کی پہچان کرنا اصول اجتہاد کا اہم رکن ہے۔ نسخ کا مطلب ہے حکم یا اس کے کچھ حصہ کا اٹھ جانا۔ نسخ و تخصیص میں فرق یہ ہے کہ تخصیص میں کسی دور میں بھی بنا بر عموم حکم کو ہمارے لئے لازمی قرار نہیں دیا گیا۔ مثلاً مشرکات سے نکاح کی حرمت میں شروع ہی سے اہل کتاب کی عورتیں اس میں شامل نہ تھیں جبکہ نسخ میں حکم کے عموم پر عمل کیا جاتا ہے جب تک اس کے کچھ حصہ یا سب کا بطلان نازل نہیں ہو جاتا۔

ابن حزم نسخ کی تعریف کچھ اس طرح کرتے ہیں:

'' انہ بیان انتھا ء زمان الامر الاول فیما لا یتکرر'' [22]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ حکم کی مدت ختم ہو گئی ہے۔

بعض لوگ ثابت شدہ حدیث یا آیت کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ منسوخ ہے یا اس کے حکم کو خاص کیا گیا ہے۔ابن حزم کہتے ہیں کہ ان کی بات بغیر دلیل کے تسلیم نہیں کی جائے گی کیوں کہ وہ اس آیت یا حدیث پر عمل نہ کرنے کا کہہ رہے ہوتے ہیں۔ابن حزم اس طرح کے دعوے کی تردید پرزور طریقے سے کرتے ہیں۔فرماتے ہیں:

لا یحل لمسلم یؤمن باللہ والیوم ان یقول فی شیئ من القرآن و السنۃ ھذا منسوخ الا بیقین[23]

اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھنے والے کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ قرآن وسنت کے کسی حکم کو منسوخ کہے الا کہ اسے اس کے منسوخ ہونے کا یقین ہو۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

" ولا یحل ان یقال فیما صح ورود الامر بہ ھذا منسوخ الا بیقین و لا یحل ان یترک امر قد تیقن وروده خوفا ان یکون منسوخا ولا ان یقول قائل لعلہ منسوخ۔"[24]

جو نقل صحیح سے ثابت ہو اسے منسوخ کہنا جائز نہیں الا کہ اس کے نسخ کا یقین ہو اور نہ کسی حکم کو اس خوف سے ترک کرنا درست ہے کہ کہیں وہ منسوخ نہ ہو اور نہ یہ کہنا جائز ہے کہ ہو سکتا ہے یہ منسوخ ہو۔

نسخ کا دائرہ کار:

امام ابن حزمؒ عقلی بدیہیات کو خصوصی اہمیت دیتے ہیں اور بہت سے مقامات پر اس سے استدلال کرتے ہیں لہٰذا ان کی رائے میں ایسے عقلی احکامات جن میں تغیر و تبدل کا امکان نہ ہو وہاں نسخ جاری نہیں ہوتا ۔اس بات کے باوجود وہ اللہ کی قدرت کی نفی نہیں کرتے بلکہ یہ کہ اللہ ان کے نسخ پر قادر ہے یا نہیں کسی بھی طرح کی گفتگو کو درست نہیں سمجھتے اور ایسی گفتگو کرنے والے کے بارے میں کہتے ہیں:

"تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ کہ تم خطاکار ہو اس لیے کہ تم یہ فیصلہ کرتے ہو کہ تم الٰہی امور کی تدبیر کر رہے ہو اور اللہ کو اپنے عقلی قوانین کے تابع کر رہے ہو۔"[25]

امام ابن حزمؒ کے نزدیک نسخ کا دائرہ کار صرف اوامر و نواہی میں محدود ہے۔اوامر و نواہی کے علاوہ میں نسخ نہیں لکھتے ہیں۔

کلام کی زیادہ سے زیادہ چار اقسام ہیں:

۱۔امر ۲۔رغبۃ ۳۔خبر ۴۔استفہام

استفہام، رغبت اور خبر میں نسخ لاگو نہیں ہوتا۔اس وقت اسے رجوع کہتے ہیں اور رجوع کا مطلب ہوتا ہے کہ جس خبر سے رجوع کیا گیا وہ خبر جھوٹی ہے۔[26]

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ کہ اگر کسی آیت یا حدیث میں ایک سے زیادہ احکامات بیان کئے گئے ہوں اور ان میں سے کوئی ایک حکم منسوخ یا خاص کر دیا گیا ہو تو اس کی وجہ سے باقی احکامات کو منسوخ نہیں سمجھنا چاہئے۔وہ اپنے حال پر برقرار رہیں گے۔امام ابن حزمؒ اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ :

"ولا یحل لمسلم ان یقول ان الحکم الآخر منسوخ من اجل نسخ ھذا الحکم المذکور معہ فی الآیۃ او الحدیث۔"[27]

کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ آیت یا حدیث میں پائے جانے والے کسی ایک حکم کے منسوخ ہونے کی وجہ وہ یہ کہے کہ دوسرا حکم جو اس ساتھ ہی مذکور ہے، وہ بھی منسوخ ہے۔

اقسام نسخ:

بعض دفعہ کسی حکم کو مکمل طور پر ختم کر دیا جاتا ہے اور کبھی اس کے کچھ حصہ کو اور اس میں تخفیف اور آسانی پیدا کر دی جاتی ہے۔اس طرح نسخ کے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں اور اس میں مشترک بات یہ ہے کہ حکم میں کسی بھی طرح کی تبدیلی رونما ہو جاتی ہے۔قرآن وسنت کے تعلق اور نسخ کو دیکھا جائے تو نسخ کی چار صورتیں بنتی ہیں:

قرآن سے قرآن کا نسخ

قرآن سے حدیث کا نسخ

حدیث سے قرآن کا نسخ

حدیث سے حدیث کا نسخ

یہاں اہل علم کے نسخ کے بارے میں مختلف نظریات ہیں کوئی کہتے ہیں کہ یہ شریعت کی دستاویز ہیں ان میں نسخ سرے سے ہے ہی نہیں۔بعض کا خیال تھا کہ قرآن کا حدیث سے پہلے درجہ ہے لہذا قرآن حدیث کے لیے ناسخ ہو سکتا ہے۔مگر حدیث قرآن کے لیے ناسخ نہیں بن سکتی۔بعض کا خیال تھا کہ قرآن و حدیث دو اصل ہیں ان میں سے کوئی اصل دوسری کے لیے ناسخ نہیں بن سکتی۔ان کے برعکس ابنِ حزم قرآن و

حدیث کو ایک ہی چشمے کے دو دھارے قرار دیتے ہیں اور وجوبِ اطاعت میں برابر قرار دیتے ہیں۔ لہذا ان کے نزدیک قرآن وحدیث میں سے ہر ایک دوسرے کے لئے ناسخ بن سکتا ہے۔

بہر حال وحی ہی وحی کے لیے ناسخ بن سکتی ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

اقل ما قیل کا اصول:

اختلافی معاملات میں شرعی حکم معلوم کرنے کے لیے ابنِ حزم کئی ایک مقامات پر اس اصول کا ذکر کرتے ہیں اور اس سے اخذ واستدلال کرتے ہوئے فیصلہ کرتے ہیں۔ اس سے مراد ہے کسی معاملے میں علمائے اسلام کا نکتہ اشتراک جس پر سب کا اتفاق ہو۔ اس اصول کے بارے میں ابنِ حزم لکھتے ہیں:

نحن محقون بالاخذ باقل ما قیل عنداللہ بیقین لانہ امر مجتمع علیہ والاتفاق من عند اللہ ولزوم ما اجتمع علیہ فرض لا شک فیہ ''[28]

ہم اقل ما قیل کو یقینی طور پر حق سمجھتے ہیں، اس لیے کہ اس پر سب کا اتفاق ہوتا ہے اور سب کا متفق ہونا اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جس پر سب کا اتفاق ہو اسے اختیار کرنا فرض ہے۔

ابن حزم کے نزدیک یہ اجماع ہی کی ایک صورت ہے۔ اقل ما قیل کو سمجھنے کے لیے ایک مثال ذکر کرتے ہیں:

دادا کی وراثت میں صحابہ کے تین یا زیادہ اقوال ہیں ان میں سے کم از کم مقدار پر مبنی قول دادا کو سدس (ترکے کا چھٹا حصہ) دینے کا ہے۔ یعنی چھٹے حصے سے زیادہ کی مقدار دینے پر اختلاف ہے مگر اس سے کم پر کوئی اختلاف نہیں کہ دادا کو چھٹے حصے سے کم نہیں دیا جائے گا اور دادا کو 1/6 سے کم دینا کسی طرح جائز نہیں ہوگا۔ اور جو سدس سے کم دینے کی بات کرے وہ اجماع کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوگا اور اس کا قول باطل ہوگا۔ ابن حزم کہتے ہیں کہ جس پر اجماع ہوا اس پر سب کا اتفاق ہوا۔ اور اس سے کچھ زائد کو واجب کرنے کے لیے کوئی دلیل چاہیے دلیل نہ ہونے کی صورت میں شک کی بنیاد پر یقینی بات کے خلاف قول صادر نہیں کرنا چاہیے۔

ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابن حزم کے نزدیک اجماع اور نص دونوں ہی ماخذ شریعت ہیں نصوص کے اندر اس طرح کا معاملہ ہو تو اضافے کا قول قبول کیا جاتا ہے وہاں اقل ما قیل کا اصول منطبق نہیں کیا جاتا جبکہ

جب یہاں مختلف لوگوں کے اقوال سامنے آتے ہیں تو اقل ما قیل کے تحت فیصلہ کیا جاتا ہے یہاں یہ فرق کیوں؟ابن حزم اس اشکال کا ازالہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

اجماع بھی دراصل نص ہی کی طرف لوٹتا ہے۔[29]

نصوص کے اندر اضافے یا زیادتی کو قبول کر لیا جاتا ہے کیونکہ نص ہی اس کو ثابت کر رہی ہوتی ہے جبکہ اجماع کی مندرجہ بالا صورت میں اس طرح کی کوئی چیز نہیں۔ لہذا شک کی بنا پر یقینی امر کو کیسے ختم کیا جا سکتا ہے۔

یقین کی شرط:

ابن حزم کے منہج استنباط واستدلال کا اہم وصف یقین واذعان کی تلاش ہے۔ وہ صرف انہی امور کو دلیل کے قابل سمجھتے ہیں جن پر قطعی یقین ہو۔ یہ الگ بات ہے وہی امر جن پر ابن حزم کو یقین واثق ہو وہ دوسرے شخص کے نزدیک ظنی ہو۔ان کے نزدیک دلیل کا قطعی اور یقینی ہونا ضروری ہے درجہ یقین سے کم ہونے کی صورت میں وہ اسے ظن قرار دیتے ہیں اور ظن کی بنیاد پر حکم اخذ کرنے کو ممنوع قرار دیتے ہیں اور اس کا استدلال درج ذیل آیت سے کرتے ہیں:

﴿ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا﴾ [30]

وہ صرف گمان کے پیچھے چل رہے ہیں اور بے شک گمان حق کے مقابلے میں کسی کام نہیں آتا۔ [31]

بلکہ ابن حزم شک اور ظن کو ایک ہی قرار دیتے ہیں۔ان کے نزدیک یہ دونوں یقین کے منافی ہیں۔اگرچہ ظن میں میلان اور ترجیح کا پہلو پایا جاتا ہے مگر یہ یقین کی حد تک نہیں پہنچ پاتا لہذا یہ شک ہی ہوا۔اسے یقین نہیں کہا جا سکتا اور اس کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔[32]

شاید یہی وجہ ہے کہ ابن حزم جمہور کے خلاف خبر واحد کو مفید علم قطعی قرار دیتے ہیں اور اجماع کے عمل کو صحابہ تک محدود رکھتے ہیں اور صرف ظواہر سے استدلال کرتے ہیں اور استصحاب کا دائرہ کار بہت وسیع کر دیتے ہیں۔ یہ بات بجا ہے کہ احکامات شریعہ کی بنیاد یقین پر ہونی چاہیے مگر اس میں اس قدر غلو کئی قسم کے مسائل کو جنم دیتا ہے کیونکہ یقین کی دو جہتیں ہیں:

صحیح ہونے کا یقین اور

غلط ہونے کا یقین۔

اب تمام مسائل انہی انتہاؤں میں نہیں ملتے بلکہ ان مقامات پر بہت کم مسائل ہوتے ہیں اکثر درمیان میں ہوتے ہیں شک ان دونوں حدوں کے درمیان کا مقام ہے۔
اس غلو کا ایک نقصان یہ ہے کہ اس کی ایک حد کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے دوسری کو نہیں۔ یعنی کسی امر کے غلط ہونے کا فیصلہ بھی اس وقت دینا چاہئے جب اس کے غلط ہونے کا یقین ہو جیسا کہ صحیح کے صحیح ہونے پر ہوتا ہے شاید یہی وجہ ہے پہلے پہل ابن حزم توقف کی روش پر چلے پھر استصحاب کے ذریعے یقین پیدا کرنے کی کوشش کی۔ دوسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ کئی امور قطعی نہیں ہوتے قطعیت میں غلو کی وجہ سے انہیں قطعی بنا دیا جاتا ہے۔
بہر حال کسی بھی بات میں غلو ہمیشہ نقصان کا پیشِ خیمہ ہوتا ہے رہا ظن کا معاملہ ان الظن لا یغنی من الحق شیئا اور یہ کہ ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث یا یہ ان بعض الظن اثم۔ تو ان میں دلائل کے مقابل اپنی رائے کو ظن کہا گیا ہے دوسرے یہ کہ قرآن میں لفظ ظن کو یقین کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے اور علم کا لفظ ظن راجح کے معنی میں بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ یہ آیات ہیں:

﴿وَظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ﴾: اور یقین ہو جائے گا کہ یہ وقت جدائی ہے[33].

﴿ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ﴾ [34]

اگر وہ تمہیں ایماندار معلوم ہوں تو انہیں کافروں کی طرف واپس نہ کرو۔

مذکورہ مقامات پر پہلی آیت میں ظن کا لفظ یقین کے معنی میں اور دوسرے آیت میں علم کا لفظ ظن راجح کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔
یہاں امام ابن حزم کے طریق استدلال اور اجتہاد کے منہجی قواعد کا ذکر کیا ہے تا کہ ان کی فقہی بصیرت کو سمجھنے میں مدد مل سکے اور عصر حاضر میں ان فقہی استدلالات واستنباطات سے مناسب استفادہ کیا جا سکے۔ یہ ایسے قواعد ہیں جنھیں امام موصوف مسئلہ کشید کرتے وقت بطور ایجاب اختیار کرتے ہیں اور اہتمام کرتے ہیں کہ ان سے صرف نظر نہ ہو۔

حوالہ جات وحواشی

[1] الذہبی، سیر اعلام النبلاء، مؤسسة الرسالة،الطبعة الثالثة: 1985 ، ص: 186/18

[2] ابن حزم، الاحکام فی اصول الاحکام، تحقیق:احمد شاکر، دار الآفاق الجدیدۃ، بیروت، ص : 121/5
[3] العنکبوت51:29
[4] الاحکام: 81/5
[5] مجموع الفتاوی: 19,20/4
[6] الاحکام :104/1
[7] ایضاً: 132/2
[8] المحلی:2/1
[9] مجموع الفتاویٰ :20/4
[10] الذہبی ،سیر اعلام النبذ :201/18
[11] التمہید :7/1
[12] الاحکام :112/1
[13] ایضاً :119/1
[14] ایضاً :5/2
[15] البقرۃ36:2
[16] الاحکام :59/1
[17] ایضاً :6/5
[18] الاحکام :98/3
[19] ایضاً :129/3
[20] آل عمران 3 :173
[21] یوسف 82:12
[22] الاحکام :59/4
[23] ایضاً :83/4
[24] ایضاً :31/2
[25] الاحکام :73/4
[26] ایضاً :71/4
[27] ایضاً:82/4
[28] الاحکام :50/5
[29] ایضاً: 60/5
[30] النجم53 :28
[31] المحلی:89/1
[32] النبذ، ص:91
[33] القیا مۃ 28:75
[34] الممتحنۃ 10:60